کواڑ

ایک تختی، ایک گاچی، ایک قاعدہ، ایک قلم، ایک سیاہی بھری دوات، ایک بڑا سا مٹیالے رنگ کا چوکور کپڑا، اس کے چاروں کونوں کی مضبوط گانٹھ، ہلکے بھورے رنگ کی شلوار قمیض، سادہ سے جوتے، انڈے پراٹھے کا ناشتہ، گرم دودھ کا گلاس، سر پر محبت بھرے ہاتھ کی لرزش، گال پر ہلکی سی چٹخنی، کمر پر ہلکی سی تھپک، ایک میٹھی سی دعا اور میں۔ایک نیا دن، ایک نیا سفر۔

مرغے کی بانگ سے لے کر مُلا کی اذان تک کا وقت میرے لیے نیند کی تین تہوں سے نکلنے کا وقت ہوتا تھا۔ میں اُن خوابوں سے جو کبھی پورے نہ ہونے تھے واپس ان خوابوں میں جن کا شاید کوئی امکان موجود تھا، لوٹ آتا۔اور پھر بند آنکھوں کے خوابوں سے جاگتی آنکھوں کے خوابوں تک کا سفر روزانہ طے کرتا۔کبھی حقیقت کو خواب سمجھ کر اس کے گزر جانے کا انتظار کرتا، تو کبھی خواب کو حقیقت جان کر اس میں تمام زندگی گزارنے کی خواہش۔خواب ہو یا حقیقت، ہے تو سب فانی۔اس سے پہلے بھی زندگی رہی ہو گی مگر یاد نہیں۔ ہم زندگی کے معمول کے لمحات بڑی آسانی سے

بھول جاتے ہیں۔خوشیوں کے لمحے اپنے دل کے سنگھار میز پر فخر سے سجاتے ہیں اور غم انتہائی نفاست سے لپیٹ کر الماری میں کپڑوں کے پیچھے۔ پھر جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو اس گٹھڑی کو نکالتے ہیں، پرکھتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں، گلا کرتے ہیں، اپنے آپ کو یا دوسروں کو مورِ دِالزام ٹھہراتے ہیں اور پھر ذرا سی آہٹ پر جلدی سے الماری میں کپڑوں کے پیچھے چھپا دیتے ہیں۔کوئی پوچھے کہ اٹھا باہر پھینکو، بھول جاؤ، فراموش کر دو، دفن کر دو، کیوں دل سے لگائے بیٹھے ہو۔ کیوں نہ لگائیں؟ یہ بھی تو ہماری ہی کہانی کے پرتو ہیں۔ یہ متاع فقط دل کے کواڑوں کے پیچھے ہی محفوظ رہتی ہے۔ خاندان کی باچھیں پھیلائے تصویر ہو یا ''سیلفی'' کی بے معنی مسکان، فقط ہماری ذات کے کواڑ ہی تو ہیں۔

ہم سب اسکول پیدل ہی جایا کرتے تھے۔میرا اسکول گھر سے کوئی پانچ یا چھ کلومیٹر دور ہوگا۔راستے میں سر پر بھورے رنگ کی کلغیاں سجائے سرکنڈوں سے بھرا ایک بل کھاتا راستہ بھی آتا تھا جو غالباً دو کلومیٹر کے قریب ہوگا۔اس راستے کے بارے میں بہت کچھ مشہور تھا۔خاص طور پر یہ کہ وہاں جن بستے تھے۔میرے بچپن میں ہر نہ سمجھ آنے والی کیفیت کے ذمہ جن ہی ہوا کرتے تھے، جیسے کوئی کتا آپ کو بغیر بھونکے گھور رہا ہو، کوئی گدھا بس خاموشی سے آپ کے پیچھے چلا آئے، کوئی بکری کا بچہ آپ سے نہ گھبرائے، کوئی آواز جس کا نشان نہ ملے، کوئی قبرستان میں کھڑا درخت جو ہوا کے تھپیڑوں سے جھوم اٹھے، کوئی انسان جو کسی نا قابلِ تشخیص بیماری میں مبتلا ہو یا پھر ذہنی الجھاؤ کا کوئی مریض جسے اپنے درد کو بیان کرنا نہ آتا ہو، سب جن کے ہی

کمالات تھے۔ہم نے بھی سن رکھا تھا کہ ہوا کی موجوں میں راگنی گاتے سرکنڈوں میں جن رہتے تھے۔نتیجہ تن اُس راہ میں بلی، بکری، کتے یا کسی آہٹ سے مڈبھیڑ ہمارے تخیل کے تمام دروا کر دیتی اور پھر اپنی ذہنی اڑان کی بساط کے مطابق ہمیں اپنے حصے کا خوف، ریڑھ کی ہڈی کی سردی، سر میں سرایت کرتی ٹھنڈی لہر اور رگوں میں دوڑتے خون کی روانی کے جم جانے کا پتا مل جاتا۔اکیلے جانا تو کبھی ٹھہرا نہیں، محلے کے بچوں کے ساتھ علی الصبح جاتے اور روزانہ ہی شاہراہِ جن سے بھاگ کر گزرتے۔اگر کبھی بکری یا گدھا مل جاتا تو اسکول جلدی پہنچ جاتے اور کتا ملنے کی صورت میں تو اسکول میں پہلا قدم ہم ہی رکھتے۔اس انجانے خوف کا بھی عجب مزہ تھا۔ پہلے لوگ ''جن چڑھ گیا جی'' کہہ کر جان چھڑا لیتے تھے۔ اب پڑھے لکھے حضرات اسے Andrenaline Rush کا لقب دے کر تحقیق میں مصروف ہیں۔

ہمارا اسکول اپنے اندر ایک دنیا تھا۔ چار فٹ کی مٹی کی دیوار جو جگہ جگہ سے ریخت کا شکار تھی۔ دروازے کی ضرورت کبھی کسی نے محسوس ہی نہیں کی۔کس کو محفوظ رکھنا تھا؟ کچھ ایسا تھا ہی نہیں جس کی پردہ داری ہو۔انسان وحیوان بلاخوف وخطر آتے جاتے۔قدرت کی نعمتوں سے مستفید ہوتے اور جسم کی مجبوریوں سے پیچھا چھڑاتے۔

اسکول کے اندر دو کمرے، چار درخت، ایک کنواں اور چار میز، کرسیاں۔یہی کل کائنات تھی۔ درخت ہماری کلاسیں تھے، کرسیاں اساتذہ کرام کے لیے اور

کمروں میں بھی کوئی بیٹھتا تھا۔ معلوم نہیں کون۔ استاد کے سامنے ٹاٹ کے مستطیل ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔ ان میں سے کچی مٹی اور شبنم کی بوندوں کے ملاپ سے سوندھی مہک آتی تھی۔ ان نم آلود بوسیدہ ٹاٹ کے ٹکڑوں پر ہم حصول تعلیم کے لیے بیٹھتے تھے۔ کچھ VIP طلبا اپنے ساتھ صاف دری بھی لاتے اور استاد کے قرب میں مقام پاتے۔ استاد جی کا صدیوں پرانا بیگ صبح ان کی آمد پر میز پر براجمان ہوتا اور ان کے جانے پر ان کے ساتھ چلا جاتا۔ میں نے تو کبھی اس کو کھلتے یا اس میں موجود خزانے کو ہوا لگتی نہ دیکھی۔ دور کونے میں ایک کنواں تھا جس کے حلق میں ایک ڈول رسی سے لٹکا رہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ بہت زور لگاتے اور کنویں کی تاریک گہرائیوں سے اپنے حصے کا پانی چھین لاتے۔ اِدھر پانی سے بھرا ڈول چھلکتا ہوا کنویں کی منڈیر پر نمودار ہوتا، اُدھر ہر سو معصوم قہقہے بکھرتے۔ محنت کے صلے کی راحت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ہماری تمام تر غیر نصابی مصروفیات کا محور یہی کنواں تھا۔

ہمارے اسکول میں طریقہ تعلیم بہت سادہ تھا۔ یہ پرانے اساتذہ تحقیق کم کرتے اور توجہ زیادہ دیتے تھے۔ اسکول کے دن کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوتا۔ اس کے بعد نعتِ رسولؐ مقبول پڑھی جاتی۔ بعد ازاں نویں یا دسویں جماعت کا کوئی طالب علم ایک سے لے کر بارہ تک کے پہاڑے با آوازِ بلند پڑھتا اور ہم سب اس کی لے میں لے ملا کر اس کے ساتھ پڑھتے۔ آج بھی اگر کچھ حساب کرنے بیٹھوں تو پہاڑے پنجابی ہی میں یاد آتے ہیں۔ اس کے بعد پورا اسکول جناب حفیظ جالندھری کا تحریر کردہ اور جناب احمد چھاگلا کی لافانی موسیقی سے آویزاں پاکستان کا

قومی ترانہ اس احترام اور جذبے سے پڑھتا کہ جیسے پاکستان پھر سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس جنون کو جناب علامہ محمد اقبال کی دعا، ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' کچھ ایسا دوام بخشتی کہ پورا قصبہ ان تحریر و سرور کے معجزات میں رنگ جاتا۔ ان تیس منٹوں میں دنیا بھی سنور جاتی اور آخرت بھی۔ اور پھر طلبا کی بل کھاتی قطاریں اپنے اپنے درختوں کی جانب چل دیتیں۔

قاعدہ پڑھتے، کانے کی قلم کی نوک سنوارتے، سیاہی کو نکھارنے کے لیے پھر پھر قلم کو دوات میں ڈوبے دیتے اور تختی لکھتے آدھا دن گزر جاتا۔ خوشخطی ضرورت نہیں، لازم و ملزوم تھی۔ اُن انگلیوں کی شامت آ جاتی جو اپنا فرض ادا نہ کرتیں۔ بریک میں تختی دھوتے اور گاچی مل کر سوکھنے رکھ دیتے۔ ایسے میں جب بچے اپنا بچہ ہونے کا ثبوت دیتے نظر آتے، ہم تین دوستوں کے ذمے ایک سزا تھی جو ہمیں بہت پیاری تھی۔ بقول استاد جی کے، ہماری خوشخطی ان کے عظیم مرتبت معیار پر پورا نہ اترتی تھی اس لیے ہر بریک میں بازار سے ترکاری خرید کر ان کے گھر پہنچانا ہماری ذمہ داری تھی۔ شاید اسی سزا کی بدولت ہم تینوں کبھی اچھے تختی باز نہ بن سکے۔ ہم یہ مشعل کسی اور کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہی نہ تھے۔ خوش قسمتی سے استاد جی کو کبھی یہ راز معلوم نہ ہوا۔

استاد جی سے پیسے لے کر ہم دوڑتے ہوئے بازار پہنچتے۔ اپنی رفتار کو برق رفتار بنانے کے لیے ہم نے تخیل کا سہارا لے رکھا تھا۔ ہم نے ایک درخت سے لمبی

اور نسبتاً لچکدار ٹہنیاں توڑ کر اور انہیں موڑ کر دائرے کی شکل دے رکھی تھی۔ ان کے سِروں کو دھاگے سے مضبوطی سے باندھ کر، اس دائرے میں دھاگے ہی سے کراس بنا لیا تھا۔ اَب ہمارے لیے یہ سٹیرنگ ویل تھا اور ہم گاڑی۔ اَب جب انہیں پکڑ کر استاد جی کے گھر کی جانب بھاگتے تو راستہ ہوا ہو جاتا۔ فتح ہم تینوں میں سے زیادہ برق رفتار تھا۔ وہ آگے آگے بھاگتا اور منہ سے ہارن کی آواز بھی نکالتا جاتا۔ ہم دونوں فقط اس کی گرد کا پیچھا کرتے۔ ترکاری کا تھیلا بھی اسی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دروازہ جس کے پار ہمارے تخیلات کا جہان آباد تھا، آ جاتا۔ استاد جی کا گھر۔

پکی چار دیواری میں پرویا ہوا لکڑی کا معمولی سا دروازہ ہمارے اور اس اَن دیکھی دنیا کے درمیان حائل رہتا، جیسے کوئی نقاب ہو۔ فتح لوہے کی زنگ آلود کنڈی سے دروازے پر دستک کچھ اس ادا سے دیتا، جیسے زنجیرِ عدل کھینچ رہا ہو۔ مگر اس دستک سے ہمارے سانس رک جاتے۔ وقت تھم جاتا لیکن لمحے طویل ہو جاتے۔ پھر دو کواڑ چٹختے، جُھول کھاتے اور آہستہ آہستہ لبوں کی مانند کھلتے چلے جاتے۔ روشنی کی کرنیں چھَن سے ہمارے قدموں کو چومتیں۔ ان کی حرارت سے پیر سہلانے لگتے۔ نور کے اس سیلاب میں ہولے سے پہلے ایک بند مٹھی نمودار ہوتی۔ پھر چھنکتی سونے کی چوڑیاں جھلملاتی آتیں اور پھر وہ کلائی، جو کچھ اس طرح سے اس روشنی کے بہاؤ کو اضطراب میں مبتلا کرتی جیسے کسی معجزے نے سمندر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہو۔ اگلے ہی لمحے مخروطی انگلیوں کا زندان وا شگاف ہوتا اور لوحِ محفوظ پر تراشی قسمت کی لکیریں کرنوں کی چادر اوڑھ لیتیں۔ حِنا کی پہیلیاں مسکرانے لگتیں۔ انہی وادیوں کے بھنور کے عین

بیچ ستر نگے کاغذ میں لپٹی تین ٹافیاں لعل و یاقوت کی مانند دمکنے لگتیں۔ فتح خاموشی سے وہ پرساد اُچک لیتا، اس احتیاط سے کہ لَمس کا کوئی بہانہ نہ ہو، اور ترکاری کا تھیلا اس کے مالک کے حوالے کر دیتا۔ کواڑ پھر چٹختے، مچلتے اور لب بھینچ لیتے۔ ہم اُسی تیزی سے واپس سکول کو فراٹے بھرتے دوڑ جاتے۔ اس سارے ماجرے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگتا مگر معراج کا وقت سے کیا تعلق۔ عشق کی نگری میں صدیوں کے لمحے اور لمحوں کی صدیاں کونسی نئی بات ہے۔

باقی دن یونہی قاعدہ پڑھتے اور تختی لکھتے گزر جاتا۔ عصر کی نماز کے بعد واپسی کا سفر بھی صبح کے سفر کی مانند شاہراہِ جن کی برکت سے جلدی گزر جاتا۔ اسکول سے آ کر کھانا کھاتا، نماز پڑھتا، محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا اور سو جاتا۔ پھر صبح، جن، کلائی، کھیل، رات کی چادر اور خواب۔

بچپن بھی زندگی کا ایک عجیب لمحہ ہے۔ آپ کچھ چاہتے بھی ہیں اور کچھ نہیں بھی چاہتے۔ کبھی معمولی سی بات گھنٹوں کی ہنسی میں بدل جاتی ہے اور کبھی ایسی ہی کوئی معمولی سی بات دل کو ایسی لگتی ہے کہ بھلائے نہیں بھولتی۔ انسان محبت، نفرت اور حسد محسوس تو کرتا ہے مگر ان کے نام نہیں جانتا۔ ہمارے بڑے کبھی ہماری غلط باتوں کا جواب بھی تحسین سے دیتے ہیں اور کبھی صحیح بات کا صلہ بھی تھپڑ اور گالیاں ٹھہرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بچے کے خیالات و جذبات کو بڑے اپنی وقتی ذہنی کیفیت پر پرکھتے ہیں۔ میں نے بچوں کو بسا اوقات اس اضطراب میں مبتلا دیکھا ہے۔ ''میں

نے کیا کیا؟''، ''مجھے کیوں مارا؟''، ''میرا کیا قصور ہے؟'' سوال ہی سوال مگر کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس لیے نہیں کہ بڑے جواب دینا نہیں چاہتے بلکہ زیادہ تر اس لیے کیونکہ بچے سوال کرتے ہی نہیں۔ انہیں اپنے سوال کے جواب کا خوف خاموش رکھتا ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے دوسروں کو خوش رکھنے کی بیماری ہمیں بچپن ہی میں لگتی ہے۔ کچھ کو شفا مل جاتی ہے۔ باقی سب اس موذی مرض میں تاحیات مبتلا رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے احساسِ محرومی اور رقابت داری کی ابتدا گھر سے ہی ہوتی ہے۔ یہ کام بڑوں کا ہے کہ وہ بچے کی آنکھ کی نمی کو سمجھیں، اس کے ہونٹوں کے تھرکنے کی وجہ جانیں، اس کی انگلیوں کے گرداب کا سراغ لگائیں، اس کے پیروں کی مصوری کی کھوج کریں، جانیں کہ ان کا لختِ جگر زیادہ خاموش کیوں رہتا ہے؟ کہاں غائب رہتا ہے؟ کیوں تنہا رہتا ہے؟ کیوں بات بات پر بھڑک جاتا ہے؟ کیوں بلاوجہ رو دیتا ہے؟ اور کیوں رات کو چہرہ کمبل سے ڈھانک کر سوتا ہے؟ کیا اس کا دم نہیں گھٹتا؟ یا کوئی خوف ہے جو دم گھٹنے کے احساس پر بھی بھاری ہے۔ کچھ ہی سالوں کی تو بات ہے جب جواب نہیں ملتے۔ ہاں، جب جواب سمجھ آنے لگیں تو یہ بڑے نصیحتوں کا پنڈارا لے کر آ دھمکتے ہیں اور اپنی خامیوں اور ناکامیوں کے چورن سے ان کے مستقبل کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب سوال ہی نہیں تو جواب کیسا۔

وقت دنوں میں اور دن مہینوں میں بدلتے رہے۔ پہلے استاد جی کی مسکراہٹ دھیمی پڑی پھر ماند پڑ گئی۔ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے کنارے سکڑ کر محراب بن گئے۔ چال کا غرور اور گردن کا تناؤ کم ہوتا گیا۔ اسی مناسبت سے استانی جی کی کلائی کی

سونے کی چوڑیاں کم ہوتے ہوتے روپوش ہوگئیں۔ان کی جگہ زخم دیتی کانچ کی بے ہنگم چوڑیوں نے لے لی۔ پھر یہ چوڑیاں بھی اپنے پیچھے خونی داستانیں رقم کرتیں غائب ہونے لگیں۔ ہم استاد جی کی سرد خاموشی اور استانی جی کی زندگی میں چھائے گہرے سناٹے سے برپا ہونے والے ہیجان سے بےخبر ترکاری کا تھیلا فرض سمجھ کر پہنچاتے رہے۔ کہتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے۔ غلط کہتے ہیں۔عشق ہماری ذات کو منعکس کرتا ہے اور دوسروں میں فقط اپنا عکس ڈھونڈتا ہے، جو اصل میں ہر شخص کے لیے حسین ترین عکس ہے۔اپنی ذات کی نفی کون برداشت کرتا ہے۔ عاشق اس بنیاد پر ایمان لے آتا ہے اور ضرورت، خواہش یا نتیجے کی بساط سے عاری ہو جاتا ہے۔عشق تخیل کی معراج ہے اور دنیا مجبوریوں کا صحرا جہاں زندگی سراب اور پیاس کی الجھن سے ہی نہیں نکل پاتی۔

پھر کیا ہوا کہ استاد جی کے لہجے کی کاٹ ان کے ہاتھ میں موجود چھڑی میں جا بسی۔ان کی چھڑی کو جن چڑھ گیا اور ہم بلاوجہ پٹنے لگے۔ہم آہ وزاری تو کرتے لیکن فریاد نہ کر سکتے۔کس سے کرتے؟ ہمارے بچپن میں استاد کی شکایت کرنا ان کی معتبری میں حائل ہوتا تھا۔ بچوں کے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا اور وقت کے بھنور میں دفن ہو جاتا۔ ظالم ومظلوم دونوں ہی اس راز کو قبروں میں اپنے ساتھ لے جاتے اور دنیا اُجلی اُجلی رہتی۔مگر جس کے آنگن میں قبر ہو، وہ کیسے بھولے؟ کیسے بتائے؟ کیسے سوئے؟

تین سال بیت گئے۔استانی جی کی کلائی ویران ہوگئی۔ ہمارے لعل یاقوت بھی

گرد میں تبدیل ہو گئے۔قسمت کی وادیوں کو مٹی نے بھر دیا اور کواڑوں کے پیچھے کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

ایک دن صبح جب استاد جی آئے تو آتے ہی گویا ہوئے، ''جو کرنا ہے کرو، بس مجھے تنگ مت کرنا''۔ یہ کہہ کر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئے اور خلا میں گھورنے لگے۔ان کی آنکھوں میں نمی اور سرخی کا عجیب امتزاج تھا۔دوپہر کو فتح کے ہاتھ میں پیسے تھمائے اور خاموش رہے۔ہم بھی روزانہ کی طرح ترکاری لے کر کواڑوں کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔فتح نے کنڈے سے دروازے پر دستک دی۔ہم نے آنکھیں جھکا لیں اور کسی آہٹ کا انتظار کرنے لگے۔آہٹ تو ہوئی مگر ایسی جیسے صور پھونکا گیا ہو۔ایک لمحے میں دروازے کے دونوں کواڑ ماتم کرتے ہوئے اپنی فصیلوں سے جا ٹکرائے۔ طوفانِ نوحؑ کی مانند روشنی کا ٹھاٹھیں مارتا بے رحم سمندر ان نوحہ خواں کواڑوں نے ہم پر انڈیل دیا۔آنکھیں چندھیا گئیں۔لاشعوری طور پر ہاتھوں اور پلکوں نے سب در بند کر دیئے۔جب وہ لمحہ گزر گیا تو ہم نے ہولے سے آنکھیں کھولیں اور انگلیوں کی دراڑوں سے باہر جھانکا۔ایک انسانی ہیولا سا نظر آیا۔اپنے تجسس کی تسکین کے لیے جھٹ سے نگاہیں اس کی کلائی پر مرتکز ہو گئیں۔اور ساری متاع ہی لٹ گئی۔یہ کون ہے؟ یہاں کیا کر رہی ہے؟ ہزاروں سوال مگر کوئی جواب نہیں۔پھر ایک چبھتی سی آواز، ''استانی چلی گئی۔تھیلا مجھے دے دو اور جاؤ''۔فتح نے تھیلا اس بے ہنگم چیز کے ہاتھ میں تھما دیا۔صور پھر پھونکا گیا اور کواڑ بند ہو گئے۔